محمد جعفر پھلواروی

عملی زندگی میں خیر و شر

انسان کا نصب العین مختلف اقدار کے راستے سے "قدر الاقدار" تک پہنچنا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں چند اہم حقائق کو بھی پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

جہاں تک ایک اچھی اسکیم کا تعلق ہے یہ ذہن رسا کے لیے دشوار کام نہیں۔ آبادی سے دور کسی ویران غار کوہ میں بیٹھ کر انسان اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات و تصورات قائم کر سکتا ہے۔ دشواری کا وہاں پتہ چلتا ہے جہاں ان اسکیموں کو بروئے کار لانا ہو۔ اس مقصد کے لیے انسان کو دنیا میں آنا پڑتا ہے۔ عقیدے سے عمل کی طرف، تجرد سے تعمل کی طرف اور ویرانے سے آبادی کی طرف آنا پڑتا ہے۔ ایک انجینئر اپنے ذہن میں ایک نفیس کوٹھی کا نقشہ آسانی سے تیار کر سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے اس کے لیے سخت ذہنی کاوش کرنی پڑے۔ لیکن اصل دشواری کا احساس اسے اس وقت ہوگا جب اس نقشے کو کاغذ پر منتقل کرے گا۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ کاغذی نقشے سے جب وہ مشہود شکل میں لانے کھڑا ہوگا تو زمین کا انتخاب، مواد کی فراہمی، کاریگروں کی تلاش، نگرانی کے فرائض، وقت کا انتظار بھی کرنا ہوگا اور پھر بھی ہر ہر قدم پر سینکڑوں قسم کی نئی نئی رکاوٹیں، دشواریاں اور الجھنیں پیش آتی رہیں گی جن میں بعض تو ایسی ہوں گی کہ ذرا سی غفلت پوری اسکیم کو درہم برہم کر سکتی ہے یا پورے نقشے کو بگاڑ سکتی ہے۔

یوں ہی سمجھیے کہ علائق دنیا سے الگ ہو کر محض خوشنما تصورات میں کھوئے رہنا دشوار نہیں۔ دشواریوں کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ان تصورات و اقدار کو مشہود پیکر میں لانے کے لیے آباد دنیا اور اس کے معاشرے سے پالا پڑے۔ اس وقت بقائے اقدار میں جو شدید کش مکش پیدا ہوتی ہے اس کا اندازہ وہ لوگ کر ہی نہیں سکتے جو قطع علائق کر کے کسی زاویۂ خمول میں بیٹھے ہوئے آسمانِ تخیل میں شاعرانہ پرواز کیا کرتے ہیں۔ اور عملی دنیا سے انہیں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اعلیٰ اقدار کو ذہن میں رکھ کر جب دنیا میں آنا پڑے تو کسی "قدر" کے حصول کے لیے اسی "قدر" کو بعض اوقات مجروح کرنا پڑتا ہے۔ اس کے سوا چارۂ کار ہی نہیں۔ ایک مثال سے اسے یوں سمجھیے کہ انسانی جان کی بڑی قدر و قیمت ہے

اس لیے ظاہر ہے کہ انسانی جانوں کو محفوظ رکھنا بڑی اعلیٰ قدر ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں لیکن انسانی جانوں کی حفاظت ہی کی خاطر انسانوں کا خون بہانا بھی بعض اوقات لازمی ہوتا ہے اور ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں جب کہ ایک اعلیٰ مقصد کے لیے انسانی خون بہانا ہی اعلیٰ قدر ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے انسان کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو اس قاتل کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ کیوں؟ بہ ظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو کام قاتل نے کیا ہے وہی کام سوسائٹی کرتی ہے۔ اس نے بھی قتل کیا اور سوسائٹی بھی قتل ہی کرتی ہے۔ دونوں میں بظاہر کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن قاتل کو اس کے قتل کی سزا قتل کی شکل میں اس لیے دی جاتی ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو ایسے مزید ارتکاب جرم یعنی واردات قتل کرنے کی جرأت بھی ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں دوسروں کے لیے بھی ایسے اقدامات کی جسارت ممکن ہو جائے گی۔ دیکھئے یہاں اس مثال میں پہلا قتل تو حرام تھا اور دوسرا قتل عین حلال ہے۔ حالانکہ دونوں کی ظاہری شکل یکساں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ پہلا قتل ناحق ہے اور دوسرا حق۔ یہ دوسرا قتل قتل ہونے کے باوجود حق کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ یہ ایک قتل بہت سے دوسرے قتل سے بچا لیتا ہے۔ ایک انسان کی جان سزا میں جاتی ہے لیکن بہت سی دوسری انسانی جانیں محفوظ ہو جاتی ہیں۔

آپ نے دیکھا؟ اصل مقصد تو یہی ہے کہ خونریزی سے اجتناب کیا جائے لیکن دنیائے عمل میں قدم رکھنے کے بعد اس نصب العین سے کبھی کبھی نیچے بھی اترنا پڑتا ہے اور یہ اسی نصب العین کے حصول کی خاطر ہوتا ہے۔ یہ تنزل محض ظاہری تنزل ہے ورنہ مقصد دونوں ہی کا انسانی جان کی حفاظت ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ بعض اوقات ایک نصب العین کے حصول کے لیے بظاہر اسی نصب العین کو مجروح کرنا پڑتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک پھوڑے کی تکلیف سے نجات دلانے کے لیے نشتر لگانا پڑتا ہے۔ اس میں تکلیف تو ہوتی ہے مگر اس کا مقصد تکلیف پہنچانا نہیں بلکہ آرام دینا ہے۔ لیکن آرام دینے کا یہ مقصد ایک نشتری تکلیف ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ مقصد آرام ہے لیکن کسی قدر اسی مقصد کو مجروح کیا جاتا ہے۔ یوں کہئے کہ قریب قریب ہر قدر کے حصول کے لیے اسی قدر کو کچھ نقصان پہنچانا بھی ایک قدر ہے اور یہ کچھ ناگزیر سی قدر ہے۔

جب ایک قدر کے حصول کے لیے اسی قدر کو مجروح کرنا پڑتا ہے تو اس طرز عمل کے اندر سے

بھی ایک دوسری اعلیٰ قدر پیدا ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر کسی قدر کو مجروح ہی کرنا پڑے اور اس کے بغیر اس قدر کا حصول ممکن نہ ہو تو کم از کم اتنا ضرور ہو کہ اس کی مجروحیت کو کم سے کم کر دیا جائے۔ مثلاً کسی کو اگر قتل ہی کرنا پڑے تو اسے کم سے کم تکلیف دی جائے۔ یا اسے اس سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے جتنی اس نے اپنے مقتول کو دی ہے۔ یا اگر کسی فساد کو دور کرنے کے لیے جنگ و قتال کرنا پڑے تو کم سے کم تعدادِ قتل پر اکتفا کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ محافظتِ اقدار کی صرف ایک شکل تھی۔ دوسری شکل یہ ہے کہ ایک قدر کی محافظت منحصر ہوتی ہے کسی دوسری قدر کے مجروح ہونے پر۔ یعنی جس قدر کو محفوظ کرنا ہو خود اسی کو تو مجروح کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن کوئی دوسری قدر مجروح ہو جاتی ہے۔ مثلاً امن و امان قائم کرنا بڑی اعلیٰ قدر ہے لیکن اس کے قیام میں کبھی کبھی سختی و تشدد بھی اختیار کرنا پڑتا ہے تشدد یا تادیب بہ ظاہر رحم و کرم کے خلاف ہوتا ہے لہذا ہر تادیبی کارروائی رحم و کرم جیسی اعلیٰ قدر کو کچھ نہ کچھ ضرور مجروح کرے گی۔ لیکن اس کے بغیر امن و امان یا ادب آموزی ہو ہی نہیں سکتی۔ اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک مقصد کے حصول کے لیے اس سے ادنیٰ مقصد کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ کھاد کی قربانی سے پودا اور پودے کی قربانی سے چوپایہ اور چوپائے کی قربانی سے انسان کو نمو حاصل ہوتا ہے۔ گویا ادنیٰ سطح کی قربانی سے اعلیٰ سطح کا نشو و نما ہوتا ہے۔ اسی طرح اعلیٰ قدر کی محافظت کے لیے کسی دوسری ادنیٰ قدر کو قربان یا مجروح کرنا پڑتا ہے۔ قدرت کا نظام ہی کچھ ایسا ہے کہ اس سے مفر نہیں۔ ایسے مواقع پر جب کہ اعلیٰ قدر کے لیے ادنیٰ قدر کو مجروح کرنا پڑے تو ایک دوسری قدر اس کے اندر سے بھی ابھرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اعلیٰ قدر کے زیادہ سے زیادہ حصول کے لیے ادنیٰ قدر کو کم سے کم مجروح یا قربان کیا جائے۔ بہ ظاہر یہی نظر آئے گا کہ ایک قدر مجروح یا قربان ہو رہی ہے لیکن در اصل دو دو قدروں کا حصول ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ کوئی اعلیٰ قدر حاصل ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ دوسری قدر کم سے کم مجروح ہوتی ہے اور یہ بجائے خود ایک اعلیٰ قدر ہے۔ فرض کیجیے ڈاکوؤں کا ایک گروہ یا ایک گاؤں زندگی کو اجیرن کیے ہوئے ہے۔ جس کا استیصال امن و امان کے لیے ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ نصیحت و پند کے تمام مراحل کے بعد اگر یہ راہِ راست پر نہ آئیں تو تادیبی کارروائی کرنی ہی پڑے گی۔ لیکن اس کا انداز یہ نہ ہونا چاہیے کہ ساری آبادی کو ختم کر دیا جائے یا ہر ایک کو لامتناہی تشدد کا نشانہ بنایا جائے۔ بلکہ اس کا لحاظ

دیکھنا چاہیئے کہ وہ کون سی کم سے کم سختی یا تادیبی کارروائی ہے جو اس فتنے کا استیصال کر سکتی ہے۔

زندگی میں بہت سے مراحل ایسے بھی آتے ہیں جہاں شر کے اندر سے خیر ابھرتی ہے۔ اس وقت انسان کو شر ہی اختیار کرنا پڑتا ہے لیکن وہ اختیارِ شر ہی عین خیر ہوتا ہے۔ یہ اُن مواقع پر ہوتا ہے جہاں انسان کے سامنے دو یا زیادہ شر ہوں۔ اور اُسے ان میں سے کسی ایک کا مجبوراً انتخاب کرنا پڑے یعنی اس کے سامنے جو چیزیں آ رہی ہیں وہ شر ہیں لیکن وہ ان سب سے بھاگ نہیں سکتا اسے کسی ایک کو اختیار کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ ایسی صورت میں یہ کرنا چاہیئے کہ جس میں شر کم سے کم ہو اسی کو اختیار کرلے۔ اسی کو اھون الشرین یا اھون البلیتین (LESSER EVIL) کہتے ہیں۔ یہاں بظاہر انسان شر ہی کو اختیار کرتا ہے لیکن دراصل یہ خیر ہی ہے کیونکہ صرف خیر کو اختیار کر لینا ہی ایک قدر نہیں۔ بڑے شر سے بچ جانا بھی خیر ہی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ انسان کسی ایسی جگہ پھنس جاتا ہے جہاں اس سے کہا جاتا ہے کہ یا تو شراب پیو یا فلاں کو قتل کرو ورنہ تم کو جان سے مار دیا جائے گا۔ یہاں اس کے سامنے تین شر ہیں: جان دینا، شراب پینا، اور کسی کو قتل کرنا۔ اب اسے ان تینوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنا ہوگا۔ ایسی حالت میں اگر اسے جان بچانا ضروری ہے تو اسے شراب پینے کو قتل پر ترجیح دینی پڑے گی۔ مگر ہاں یہ ضروری نہیں کہ ہر موقعے پر ایسا ہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کسی موقعے پر جان دے دینا ہی اعلیٰ قدر ہو۔ ایسے مواقع پر انسان کو جلد سے جلد نیک نیتی و اخلاص کے ساتھ سوچ کر فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ کس چیز کو اختیار کرے اور کسے چھوڑ دے۔ اس وقت تھوڑے سے وقت میں ہر قدر کے تمام پہلوؤں کے قریب اور بعید نتائج کو نیز عارضی اور مستقل اثرات کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ اور قرآنی اصطلاح میں اسی فیصلے کا نام حُکم اور حکمت ہے۔ انسان اس میں بڑی ٹھوکریں کھاتا ہے اور وحی انہی ٹھوکروں سے بچنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ یا یوں کہیئے کہ وحی الٰہی یہی حکم و حکمت پیدا کرنا چاہتی ہے۔ وحی کے باوجود انسان سے اس میں لغزشیں ہوتی رہتی ہیں اور اس کی تلافی اخلاص یا نیک نیتی سے ہوتی ہے۔

وحی کی روشنی میں ایک اسلامی معاشرہ جو بھی قانون تجویز کرے گا اس کا شر سے قطعی پاک ہونا بالکل ناممکن ہے۔ ہر قانون میں کسی نہ کسی نقصان کا پہلو ضرور موجود ہوگا۔ لہٰذا معاشرے کا کام صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ شر کو زیادہ سے زیادہ دور کرے اور خیر کو زیادہ سے زیادہ سمیٹے۔ جب دونوں پہلو سامنے آئیں تو یہ فیصلہ کرے کہ کس میں خیر غالب ہے اور کس میں شر غالب۔ پھر چونکہ شر سے کلیتہً

اجتناب اور خیر کل کا حصول انسانی اختیار سے باہر ہے اس لیے اسے یہی کرنا پڑے گا کہ غالب شر کو ترک کر کے غالب خیر کو منتخب کرے۔ اس سے زیادہ انسان اور کچھ نہیں کر سکتا۔

ہمارے معاشرے میں یہ ایک عام دستور ہے کہ جب کوئی ہدایت جاری ہوتی ہے یا کوئی تجویز پیش ہوتی ہے تو اس کے پہلوئے خیر پر تو نگاہ نہیں جاتی۔ بس شر کے پہلو پر غور و خوض شروع ہو کر اس کے کیڑے نکالنے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ طرز عمل درست نہیں۔ ہمیشہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ اگر یہ مناسب نہیں تو مناسب کیا ہے؟ ایک تجویز کی جگہ دوسری تجویزیں رکھیئے۔ اس کے بعد دیکھئے کہ کم سے کم شر یا زیادہ سے زیادہ خیر کس میں ہے۔ بس وہی اختیار کر لیجئے اور "خیر بے شر" کا خیال چھوڑ دیجئے۔ قانونی دنیا میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ آج ہم جسے خیر غالب یا شر مغلوب سمجھ کر اختیار کر لیں اس کا ہمیشہ خیر غالب یا شر مغلوب رہنا ضروری نہیں۔ یہ عین ممکن —— بلکہ کچھ ضروری سا —— ہے کہ آج ہم جس چیز کو اختیار کر رہے ہیں وہ کل قابل ترک ہو جائے۔ یعنی خیر غالب خیر مغلوب اور شر مغلوب شر غالب ہو جائے۔ ایسی صورت میں اہل فکر حضرات کا فرض ہے کہ وہ سابق تجویز پر نظر ثانی کریں اور اس میں مناسب تبدیلی کریں۔ اسی کا نام ہے اجتہاد۔ اور اس سے کسی دور میں بھی مفر نہیں۔

تاریخ جمہوریت

مصنفہ شاہد حسین رزاقی

قبائلی معاشروں اور یونان قدیم سے لے کر عہد انقلاب اور دور حاضرہ تک جمہوریت کی مکمل تاریخ جس میں جمہوریت کی نوعیت و ارتقا، مطلق العنانی اور جمہوریت کی طویل کش مکش، مختلف زمانوں کے جمہوری نظامات اور اسلامی و مغربی جمہوری افکار کو بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے۔ قیمت آٹھ روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور